''بچے بیاہے ہوئے ہیں اور اپنے بچوں اور بکھیڑوں میں الجھے ہوئے ہیں..''

''اور بیوی؟''

''وہ یونہی چلتی پھرتی ایک شام چلی گئی تھی..''

''آئی ایم سوری..''

''سات برس ہو گئے ہیں..''

''بچے تمہارا دھیان رکھتے ہیں؟''

''الجھن کی حد تک..مجھے انہیں ڈانٹنا پڑتا ہے کہ میرا اتنا خیال رکھنے کی ضرورت نہیں کہ میں اپاہج محسوس کرنا شروع کر دوں..میں نے بڑی مشکل سے انہیں قدرے دور کیا ہے..''

''کیوں..لیکن کیوں..یہ تو ایک خوش بختی ہے کہ وہ اتنے فرمانبردار اور تمہارے لیے فکرمند ہیں، تم سے سروکار رکھتے ہیں..''

''نہیں یہ بھی اتنا ہی بڑا المیہ ہے جو تم نے ابھی بیان کیا تھا..تم اپنے بچوں کی بے توجہی کے باعث...جو دراصل بے توجہی نہیں ہے بلکہ اس معاشرے کی اقدار کے مطابق معمول ہے..تم بے ضرورت اور بیکار محسوس کرتی ہو جب کہ بے وجہ توجہ اور فکرمندی بھی ایک انسان کے لیے اذیت کا باعث بن جاتی ہے..وہ اپنا فرض ادا کرتے ہیں تہہ دل سے میرے لیے فکرمند ہوتے میری خدمت کرنا چاہتے ہیں اور مجھے ایک انسان کی بجائے مسلسل نظریں رکھی جانے والی ایک شے بنا دیتے ہیں..ہر دوسرے روز بال بچوں سمیت آ دھمکنا..میرے لیے ہر وہ شے لے کر آنا جو پہلے سے درجنوں کے حساب سے میرے پاس موجود ہے اور بار بار اصرار کرنا کہ ابو آپ باقاعدہ چیک اپ کرواتے رہیے..میں آ جاؤں گا..میں پہنچ جاؤں گی..یہ سب فکرمندیاں اور محبت کے اظہار مجھ پر بوجھ ڈالتے ہیں..''

''تم چاہتے ہو کہ تم مکمل طور پر..میری طرح نظرانداز کیے جاؤ؟''

''میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ ہمیشہ نظروں میں رہوں اور اپنی شناخت کھو بیٹھوں۔''

''رودین تم واقعی کھسکے ہوئے ہو..کیسے ناشکرے ہو..'' وہ دل کھول کر ہنسنے کو تھی لیکن اس نے ضبط کر لیا کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے اور مسکرا دی..

وہ بھی دل ہی دل میں مسکرایا کہ میں ناشکرا نہیں ہوں..اور تم ابھی ابھی جو میری ناشکری پر مسکراتی ہو تو میں ایسا نوخیز ہو گیا ہوں جو کھڑکی میں سے جھانکتی..بس سٹاپ پر کھڑی ایک لڑکی کی

ایک نظر سے گھائل ہو جاتا ہے.. بے شک وہ نظر اس کے لیے نہ ہو..

صرف مسکراہٹیں تھیں جو ان دونوں کو نوخیزی کی کشش کے قریب لاتی تھیں..

اگلے ہی پل میں وہ غصیلا اور ناراض ہو گیا ''میں کیسے کھسکا ہوا ہوں.. صرف اس لیے کہ میں اپنی زندگی بے جا مداخلت اور بے وجہ چاہت کے بغیر گزارنا چاہتا ہوں.. وہ بے شک میری علالت اور کسی اشد ضرورت میں میرا خیال رکھیں لیکن اپنے فرض کی ادائیگی اور ثواب کی خاطر مجھے بے آرام تو نہ کریں..''

وہ اس کے غصیلے پن اور ناراضی سے لطف اندوز ہونے لگی ''اور خوشی کا چار مرغابیوں سے کوئی تعلق کیوں نہیں ہوتا؟''

''بس نہیں ہوتا..'' اس نے جیسے روٹھ کر کہا ''میں جانتا ہوں کہ نہیں ہوتا..''

''او کے..'' اس نے ہتھیار ڈال دیئے..

''مجھے چڑانے کی کوشش نہ کرو..''

''میں نے تو صرف ''او کے'' کہا ہے..''

وہ کچھ دیر روٹھا رہا.. ان گدھوں کو تکتا رہا جو مقبرے کے گنبد پر پنجے جمانے کی مسلسل تگ و دو میں مصروف تھے۔

''میری جانب دیکھو رودین..''

اس کی سیاہ کوئلہ آنکھیں چہرے کی سفیدی میں جڑی اس کی سیاہ پلکوں سے الگ دکھائی نہ دیتی تھیں.. سیاہی کا ایک ڈھیر تھا..

''تمہارا کوئی بچہ.. گے.. تو نہیں ہے؟''

اس کی بے اعتنائی اور غصہ اس عجیب سوال کی تاب نہ لا کر کافور ہو گیا ''گے؟''

''ہاں.. کیا وہ سب کے سب نارمل ہیں؟''

''ہاں.. اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ بیٹے ہنسی خوشی بیاہے ہوئے اور بچوں والے ہیں..''

''تم واقعی نصیب کے دھنی ہو.. تمہیں پتہ ہی نہیں کہ ایک گے بچے کی ماں.. یا باپ ہونا.. کرب کی آخری سیڑھی ہے.. بے بسی اور اذیت کی آخری تاریکی ہے..''

''تمہارے ساتھ ایسا ہوا ہے؟''

''ہاں..''

''یہ تو ممکنات میں سے نہیں ہے کہ تم اس معاشرے کی تمام تر سہولتوں.. آسائشوں..بہترین مواقع اور سنٹری ہیٹڈ ڈرائیوز اور سوئمنگ پولز سے بھی لطف اندوز ہو سکو..اور اپنے اقدار بھی برقرار رکھ سکو..روم میں اپنی پسند سے قیام کرنے کو ترجیح دو اور پھر جو کچھ رومن کرتے ہیں وہ نہ کرو..''

''یہ میری پسند نہ تھی..ناصر بخاری کی تھی..اس کی بنیاد پرستی کی تھی..اس نے ایک ٹپیکل امریکی بنیاد پرست ہونا قبول کیا..حمد و نعت کی محافل میں اگربتیاں سلگا کر نعت خوانوں پر ڈالر لٹاتے اور علماء کرام کے چرنوں میں بیٹھ کر وہ ایک اور نوعیت کا بنیاد پرست ہو گیا لیکن..حقیقت میں یہ دونوں روپ ایک ہیں..''

''تم محض ایک تماشائی تھیں..''

''ہاں..میں ایک تنکا تھی جو ناصر بخاری اور بچوں کے تیز و تند ریلے میں بے بس بہتی تھی..تمہیں بتاؤں کہ ایک گے بچے کی ماں ہونا..اس کے جننے کی اذیت سے کئی ہزار گنا بڑھ کر ہوتی ہے..دارا..میرا دارا شکوہ..اپنے خاوند کے ساتھ رہتا ہے..''

''خاوند..''اس کے لیے ٹھٹکنے اور تحیر زدہ ہونے کا ایک اور مقام تھا..

ہاں..اور وہ ایک ناکارہ سکھ ہے..اس کے پلّے سے کھاتا پیتا ہے..بلکہ صرف پیتا ہے.. اور جب پہلی مرتبہ وہ اسے ساتھ لے کر آیا تو دارا ایک سرخ رنگ کے گوٹے تلّے سے مزّین غرارے میں ملبوس تھا..اس نے اپنے ہونٹوں پر شوخ لپ سٹک کا لیپ کیا ہوا تھا اور ایک دلہن کی مانند شرماتا لچکتا چلا آتا تھا..اس نے بنا حجاب کے کسی شرم کے مجھ سے کہا ''ماما..میٹ مائی ہسبنڈ..'' اور وہ مشٹنڈہ بالوں سے اٹا بھرا سکھ مسکراتے ہوئے اپنی داڑھی کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہتا ہے ''بہن جی..آپ تو میری ساس ہیں ناں..'' اور پھر میرے سامنے میری موجودگی میں میرے دارا کو چومنا شروع کر دیا اور وہ لجالجا کر کہتا تھا..میری لپ سٹک خراب نہ کرو پلیز..بولوز ودین..اس سے بڑھ کر امتحان کیا ہو گا..بولو..''

وہ کیا بولتا..اس آفت زدہ ڈھلتی عمر کی عورت کو ہمدردی اور چاہت سے دیکھتا رہا..

بہت دیر کے بعد..جب کہ دوپہر ڈھل کر شام میں جانے کو تھی..آصف جاہ کے گنبد پر براجمان ہونے کی کوشش کرتے متعدد گدھ اپنے ٹھکانے کی جانب لوٹ چکے تھے..اور جب مقبرہ

جہانگیر کے محافظ سیٹیاں بجا بجا کر خبردار کر رہے تھے کہ شہنشاہ اب خلوت چاہتے ہیں.. تخلیئے کی خواہش کرتے ہیں تب نتالیہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر.. صلیب کو محسوس کرتے ہوئے کہا ''تم مجھے کہیں لے جا نہیں سکتے ؟''

''کہاں؟''

''جہاں ہم ایک بچہ پیدا کر سکیں..''

غمِ حسین میں سینہ کوبی کرنے والوں کی ایک خاص ماتمی ردھم ہوتی ہے.. درد اور اذیت کی ایک لَے ایسی ہوتی ہے کہ وہ اس قدیم المیے کو اپنے سینے میں پھر سے زندہ کرتے ہیں.. عقیدے کی استقامت اور اس کا دکھ ایسا ہوتا ہے کہ جیسے ابھی یہ سانحہ ہوا ہے اور انہیں ابھی ابھی یہ خبر ملی ہے..

لیکن ان میں سے چند ایک عشق اور شرک میں فرق نہیں جان سکتے..اور سیانوں کا کہنا ہے کہ دونوں دراصل ایک ہوتے ہیں..ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا..اُس کے سوا ایک اور بُت بنا لینا..بے شک وہ ایک پرندے کی شکل میں ہو اور اسے اپنے لہو میں تیرتے رہنے کے لیے کھلا چھوڑ دینا شرک نہیں تو اور کیا ہے..

ان چند ایک میں سے نتالیہ یقیناً تھی..جو ہاتھی عشق کے روندے جانے کے بعد ایک بُت کے سامنے سجدہ ریز ہوتی تھی اور جو سینہ کوبی کرتی تھی تو صرف اس بُت کی خواہش میں..اور یوں وہ اپنے ذاتی تخیلاتی المیے کو زندہ کرتی تھی..

ایسی سینہ کوبی بہت کٹھن اور دشوار ہوتی ہے کہ اس میں ماتم کرنے والے ہاتھ کی سینے پر ہر ضرب ثواب کی بجائے گناہ کے حساب بنتی چلی جاتی ہے..

ایک آسان راستے..ثواب کے راستے پر چلنے کی بجائے جان بوجھ کر گناہ کے حصول کے لیے سینہ کوبی کرنے والوں کا حوصلہ، جرأت اور سینہ بھی بہت بڑے ہوتے ہیں۔

اور اس بڑے سینے کے اندر اگر ایک راہبانہ خواہش کی صلیب پوشیدہ ہو..سینہ کوبی اور بھی دشوار ہو جاتی ہے کہ ہاتھ اور سینے کے درمیان وہ حائل ہو جاتی ہے..مارکس اور لینن اپنی داڑھیوں سمیت موجود ہوں تو وہ اس عمل کو افیون کا نام دے کر ان کا ٹھٹھا اڑاتے ہیں..اور اس پر

مستزاد یہ کہ ایک بُت بھی ہو..اس لیے ایسی سینہ کوبی کرنے والوں کا حوصلہ اور جرأت اور سینہ بہت بڑے ہوتے ہیں..

ورق کوبی اور سینہ کوبی میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا..

تخت لاہور کے اندر موچی دروازے کے اندر ایک حویلی کے اندر سے سینہ کوب ایک اسپِ سفید کو مثال بنا کر ماتم کرتے نکلتے ہیں تو وہیں انہی علاقوں اور محلوں میں ایک اور ردھم جنم لیتی ہے جو سینہ کوبی کی لَے سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے..

چھوٹی قدیم اینٹوں کی بناوٹ والی تاریک کوٹھڑیوں میں..اینٹیں جو اپنی بوسیدگی اور طویل العمری کے سرخ سفوف جھاڑتی ہیں..سیلن زدہ دکانوں کے اندر..دبیز پوتھیوں میں ورق کے درمیان رکھے سونے یا چاندی کے ذرّے کو ورق کوب سر جھکائے ایک بھاری چوبی ہتھوڑے کے ساتھ کوٹتے ہیں..وہ کسی خاص حساب کتاب کے تحت سونے چاندی کے ان باریک ذرّوں کو ایک پھونک سے اڑ جانے والے ورقوں میں بدلنے کے لیے نہیں کوٹتے..بلکہ ان کے بدنوں میں سینکڑوں برسوں کا ورق کوبی کا جو تجربہ ہوتا ہے وہ ایک خودکار کیفیت میں یہ جان لیتا ہے اس پوتھی کو کھولے بغیر کہ اب اگر چوبی ہتھوڑے کی ایک اور زد پڑی تو ورق منتشر ہو جائے گا..اور تب وہ ہاتھ روک لیتے ہیں۔اسی لیے ورق کوبی کے لیے کسی تعلیم یا دانش کی حاجت نہیں ہوتی' صرف نسل در نسل سیلن زدہ کوٹھڑیوں میں سر جھکائے پوتھیوں کو ایک مخصوص ردھم میں کوٹتے رہنا درکار ہوتا ہے..

ورق کوٹنے کی ایک سمفنی ہے جو صدیوں پیشتر ترتیب دی جا چکی ہے اور ان کے تن بدن میں یہ میوزیکل سکور ریکارڈ ہو چکا ہے..چنانچہ ان کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوتا..ان کے جثّے کے اندر ہر شریان' ہر رگ میں' وہ سمفنی رواں ہو چکی ہوتی ہے اور اس سمفنی کا اتار چڑھاؤ..اور ترنگ ان کی انگلیوں میں اتر کر انہیں وہ مخصوص ردھم عطا کر دیتی ہے اور وہ سر جھکائے ورق کوٹتے چلے جاتے ہیں...

سینہ کوبی اور ورق کوبی کا وہی رشتہ ہے جو عشق اور شرک کے درمیان ہے...

سٹرینج آر دے ویز آف لو..

تخت لاہور کی انہی گلیوں میں سونے کے گہنے ڈھالنے والے..انہیں تراشنے والے..اور جب وہ سونے کو تراشتے ہیں تو اس میں سے نامعلوم ذرّے اڑتے ہیں..دکھائی نہیں دیتے..وہ فرش میں..فرش ڈھانپتی دریوں میں جذب ہو جاتے ہیں اور ہر برس کے آخر میں ان کی بولی ہوتی

ہے..نہ دکھائی دینے والے سونے کے ذرّوں کی قیمت لگتی ہے اور یہ قیمت وہ خاندان لگاتے ہیں جو صدیوں سے اسی پیشے سے جڑے ہوتے ہیں..سنیاروں..سونے کے زیوروں کو تراشنے والوں کے قدموں میں جو نامعلوم ذرّے اس دھات کے گرتے ہیں..انہیں سمیٹ کر..وہ بوریاں اور دریاں جمع کر کے جو فرش پر بچھی ہوتی ہیں..وہ جانتے ہیں کہ کیسے انہیں ڈرموں اور تالابوں میں ڈال کر کیسے ان میں سے سونا کشید کیا جا سکتا ہے..صرف وہ جانتے ہیں..

یہ سونے والے ایک زمانے میں اتنے متمول ہوتے تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی جنگوں کے اخراجات کے لیے ان سے ادھار لیا کرتا تھا..

نتالیہ ورق کوبوں کی ہمسائی تو تھی ہی لیکن وہ راکھ اور گندی دریوں میں سے سونے کے ذرّے تلاش کرنے والے خاندانوں کی ایک فرد بھی ہو گئی تھی جو ساری عمر اس جستجو میں رہتے ہیں کہ شاید ہمیں بیکار اور بوسیدہ اشیاء میں سے سونے کا ایک ذرّہ رودین کی صورت میں مل جائے..ہمارے نصیب میں آ جائے..

اور کبھی نسل در نسل کی تلاش کے بعد کسی نتالیہ کو ایک ذرّہ رودین کی صورت میں مل ہی جاتا ہے..اور وہ جولاہی ہو جاتی ہے..اس ایک سونے کے ذرّے کو تخیل کی کرنوں سے منور کر کے آفتاب بنا دیتی ہے اور اس کے سنہرے پن سے ایک بت تراش کر اس کی پرستش کرنے لگتی ہے اور اس کے غم میں آنسو بہاتی ہے..

اگر ایک پوتھی کے صفحوں میں پڑے سونے کے ایک ایسے ذرّے کو جس میں رودین ہو جانے کا امکان پوشیدہ ہو خط لکھا جائے تو لفافے پر پتہ درج کرنے کی چنداں ضرورت نہ ہو گی..محمد علی ڈاکیا صرف سنتا جائے گا اور اپنے بدخشانی گھوڑے کو ایڑھ لگاتا جائے گا تا آنکہ اس کے کانوں میں ورق کوٹنے کی دھم دھم سنائی نہ دینے لگے..گھوڑا قدرے بدکے گا اور ڈاکیا اس نئے پر کان دھرے ورق کوبوں کے محلے میں پہنچ جائے گا..اور خط پہنچا دے گا..

نتالیہ ہو... ہیر ہو یا ماروی..سوہنی یا جولیٹ ہو..بے شک لیلیٰ ہو ان سب کے خط نہایت حساس کان رکھتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ ان کا رودین' رانجھا' عمر' مہینوال' رومیو یا مجنوں ورق کوبوں کے کس محلے میں..کس پوتھی میں اور کون سے صفحوں کے درمیان سونے کے ایک ذرّے کی صورت پڑا ہے..اور وہ ورق کوبی کی مسلسل مترنم لے کو سنتے اس تک پہنچ جاتے ہیں..

ڈاکیا محمد علی تو محض ایک ذریعہ ہے..وہ خود بھی پہنچ سکتے ہیں..

ورق کوبی کی اس لَے نے عشق اور شرک میں فرق نہ جاننے والوں کے لیے بڑا فتور مچایا. فرید الدین عطار نے اسے کانوں میں اتارا تو وہ کپڑے پھاڑ کر رقص کرتا. اس کی لے پر جھومتا رقص کرتا اپنی دنیا ترک کر کے ویرانوں میں چلا گیا.. جہاں اس کے سامنے منطق الطیر کے پرت کھلے اور سی مرغ کی تلاش کی جستجو نے جنم لیا. تخت لاہور کے وارث شاہ حسین بھی دریائے راوی کے کناروں کی جانب چلتے تو ورق کوبوں کے اسی محلے کو اپنی راہ گزر بناتے.. ـــ میں ناہیں سب توں.. کا ورد کرتے ان کے قدم ورق کوٹنے کی ردھم سے ہم آہنگ ہوتے.. اور وہ وجدان کی اس بے مثل سمفنی کی لہروں میں بہتے راوی تک پہنچ جاتے.. گلے میں بستہ ڈالے ایک بچہ.. سکول کو جاتے ہوئے.. جس نے کبھی رودین ہو جانا تھا' جب اس محلے میں سے گزرتا تو ورق کوبی کی یہ دھم دھم اس پر یوں اثر انداز ہوتی.. ایسے ڈورے ڈالتی کہ وہ ان میں بندھ جاتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ علموں بس کریں اویار کے مصداق کتابوں کا بستہ اپنے گلے سے اتار پھینکے اور ناچتا ہوا جنگل کو نکل جائے.. لیکن اِن نئے زمانوں میں آفت یہی تھی کہ جنگل معدوم ہوتے جاتے تھے.. انہیں انسانی آبادیاں نگلتی جاتی تھیں اور ان کے معدوں کی تسلی نہیں ہوتی تھی.. ویرانے آباد ہوتے جا رہے تھے' یہاں تک کہ صحراؤں کے اندر پانی پہنچا کر انہیں اگرچہ ہریاول دی جاتی تھی لیکن وہاں ہزاروں برسوں سے مقیم پرندے اور اس کی جھاڑیوں میں پوشیدہ جھینگر اس ہریاول سے ہراساں ہو کر کوچ کر جاتے تھے..

عہد موجود میں کسی گوتم کے لیے ایک جنگل میں نکل جانے کی گنجائش نہ تھی.. چنانچہ وہ بچہ جو کسی اگلے زمانے میں اپنے رودین ہو جانے سے ہرگز آگاہ نہ تھا.. اپنا بستہ سنبھالتا اپنے مشن سکول کی جانب بڑھتا جاتا.. جہاں صبح کی دعا کے طور پر بائبل مقدس کی آیات تلاوت کی جاتیں اور ایک کالا سیاہ پادری سفید چوغے میں نہایت نامناسب لگتا بچوں کو حضرت عیسیٰ کے معجزوں پر وعظ دیتا کہ کیسے ان کے دربار میں بیماروں اور لاچاروں کے اتنا ہجوم تھا کہ ان تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ تھا تو ایک بیمار کے رشتہ داروں نے اسے کوٹھڑی کی چھت پر لے جا کر.. چھت کو ادھیڑ کر اتنا بڑا شگاف بنا کر کہ اس کی چارپائی عین عیسیٰ کے سامنے اتاری جا سکے.. اسے اتارا کہ دم عیسیٰ اس مرگ کے قریب شخص میں پھونکا جا سکے اور وہ صحت مند ہو جائے..

یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر کوئی عطار یا شاہ حسین ہو جائے..

لاکھوں لوگ ورق کوبوں کی دھم دھم سنتے تھے اور انہیں محض مشقتی مزدور سمجھتے.. جلد از

جلد اس محلے سے گزر جانا چاہتے تھے تا کہ ان کے کانوں کو کچھ آرام مل سکے..

البتہ یہ ضروری ہوتا ہے کہ اگر ورق کوبوں کی ایک ہمسائی..سونے والی خاندانوں سے متعلق کوئی نتالیہ اپنے خوابِ خانقاہی سے جاگے تو اس ردھم کو سن کر عمر بھر سینہ کوبی کرتی رہے.. جولاہی ہو جائے..

ایک ذرّے کے لیے..

اس ذرّے میں ایک تخیلاتی بُت کے امکان کے لیے..

محمد علی ڈاکیے کا بدخشانی گھوڑا اس امکان اور تخیل کی سرحد پر چلتا.. بدکتا..اپنے لامبے کان ورق کوبی کی دھم دھم اور اجنبی لے سے خوفزدہ کر کے کھڑے کرتا اس محلّے سے گزرتا تھا..

جہاں پوتھی میں پوشیدہ سونے کے ایک ذرّے کے نام ایک خط تھا..

''میں واپس نہیں جا رہی..''

سیّدزادی کی اجڑی ہوئی چھاتیوں کے درمیان..تین بچوں کے بلکتے منہ ان میں سے کومل پن' تناسب اور خواہش کو چوس چکے تھے..ان کے درمیان صرف صلیب تھی جو آباد اور زندہ تھی اور دھڑکتی تھی..جس نے بچوں کی طرح بالآخر انہیں چھوڑا نہیں تھا' ابھی تک ان کے درمیان گھر بنائے رہتی تھی..نتالیہ نے بھی اسے اپنے آپ سے جدا نہیں کیا تھا..شاید اس میں ایک مصلحت تھی' وہ اپنے آپ کو مارنے کے لیے کوئی عامیانہ حربہ..جیسے پنکھے سے لٹک جانا یا سلیپنگ پلز پھانک لینا استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی..چپ چاپ کسی بھی شب مصلوب ہو جانا چاہتی تھی..عمر کی نوخیزی میں تقریباً ہر فرد..اور ایسا فرد جو ایک خانقاہ کے ماحول میں بند کمیونزم اور روسی ادب کے واسطے سے باہر کی دنیا میں سانس لیتا ہو..موت..بلکہ خودکشی کے رومان پرور فریب میں مبتلا ہوتا ہے..ماحول اور معاشرے کی بے توجہی کا انتقام لینے آپ کو کبھی نہ کبھی مار ڈالنے کے خواب میں لینا چاہتا ہے..وہ فنا کی اٹل حقیقت سے بھی آگاہ ہی نہیں ہوتا..اس کے گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ سرسوں کے کھیتوں کی مہک' بارش کے بعد فضا دھل جائے تو ایک سرد سویر میں کنواری کی بانہوں میں چھنکتی چوڑیوں کی مانند سرد ہوا میں ایک گہرا سانس لینا..کسی نامعلوم پرندے کی آواز سننا جو کسی گھنے شجر میں روپوش ہے..صنف مخالف کے لبوں کے پہلے لمس اور جو پرندہ لہو میں تیرتا ہے' اسے اپنے اندر تیرتا محسوس کرنا..یہ سب ہمیشہ کے لیے نہ ختم ہونے والی تاریکی میں فنا ہو جاتے ہیں..زندگی کی وقعت اور اس کا لالچ عمر کے گزرنے کے ساتھ ساتھ شدید ہوتے جاتے ہیں کہ وہ محسوسات اور منظر جو موت کے داؤ پر ہارنے سے کھو جاتے ہیں' صرف وقت کے گزرنے سے ہی ان کی ثروت اور خوش بختی کا اندازہ ہو جاتا ہے..نوجوانی کے نامعلوم انداز میں کھسکتے لمحوں کے دوران نتالیہ بھی مرگ

کے اسی فریب میں مبتلا تھی..لیکن شادی کے بعد بھی جیسا کہ ہمیشہ ہی ہو جاتا ہے' اس فریب میں تعطل نہ آیا' یہ اس کی شخصیت کے ساتھ ساتھ جڑا چلا آیا... یہ نہیں کہ ناصر بخاری کی بجائے اگر روپ متی کو کوئی اور باز بہادر مل جاتا تو اس فریب میں رخنہ پڑ جاتا..بے شک رودین بھی اس کی زندگی کا شریک ہو جاتا تو بھی چنداں فرق نہ پڑتا..وہ نا آسودگی کے کچھ اور جواز تلاش کر لیتی.. یا شاید ایسا نہ ہوتا..تو پھر کینسر کی خبر نے اسے اتنا خوفزدہ کیوں کر دیا تھا..وہ کیوں ڈر کے سیاہ آسیب میں اتنی جکڑی گئی تھی کہ مرنے سے پیشتر اپنے بچوں کے علاوہ صرف اسے ملنا چاہتی تھی..اس لیے کہ وہ کسی اور کی طے شدہ موت قبول نہیں کر سکتی تھی..مرنا تھا تو اپنی من مرضی سے مرنا تھا...وہ ڈر شاید اس نے خود بھی تخلیق کیا تھا تا کہ رودین تک پہنچا جا سکے..

سیّد زادی ابھی تک..اسے صرف تین ہفتے ہوئے تھے آئے ہوئے..ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں قیام کیے ہوئے..اور اسے روزانہ ملتے ہوئے..اس کے باوجود وہ ایک اجنبی عورت تھی..ایک نا آشنا سا سراپا تھا..رجسٹر میں سے پھاڑے ہوئے کھردرے اور لکیر دار کاغذ..جن کے پھاڑنے سے وہ وہاں وہاں سے پھٹ گئے تھے' جہاں رجسٹر کی سلائیوں کے دھاگے تھے..ان پر تحریر کردہ سینکڑوں خطوط کے باوجود صرف تین ہفتے پیشتر اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا..

وہ سنائے میں آ گیا جب اس نے کہا کہ..میں واپس نہیں جا رہی..

اگرچہ وہ کہتی رہتی تھی کہ میں سب کچھ چھوڑ کر آ گئی ہوں..میں وہاں کسی کو..بچوں کو..ناصر بخاری کو درکار نہیں لیکن اس کے باوجود یہ ''میں واپس نہیں جا رہی'' ایک حتمی بیان تھا اور اس میں ایک پوشیدہ دھمکی تھی..

''واقعی؟''

''ہاں..''

''کیوں؟''

''میں نے ناصر بخاری کو طلاق کا نوٹس بھجوا دیا ہے..''

''طلاق؟''

''ہاں اسے امریکہ میں سمپل ڈائیورس کہتے ہیں اور یہ بہت عام ہے..یہاں تمہارے ہاں..آستانۂ رومی کے قرب و جوار میں طلاق کا لفظ زہریلے بچھو کی مانند ڈنک مارتا ہے..لیکن یہ اتنا ہولناک نہیں ہے..ایسا..ہمارے ہاں ہوتا رہتا ہے۔''

''تمہارے بچے؟''

''وہ تو کب کے مجھے طلاق دے چکے..میرے وجود میرے احساسات سے غافل ہو چکے..''

''کیا تم بھی ان سے غافل ہو چکی ہو؟''

''وہ میرے ساتھ ساتھ میرے تن بدن سے بندھے چلے آتے ہیں..ان کی ناڑ ابھی تک کاٹی نہیں گئی اور وہ میرے وجود کے ساتھ اسی ڈوری میں ابھی تک منسلک ہیں اور میرے بدن سے خوراک حاصل کرتے ہیں..ان میں سے کوئی ایک بھی اگر تردّد کرے میرا کھوج لگا کر مجھے ٹیلیفون کر دے کہ ماما مجھے تمہاری ضرورت ہے تو میں یہاں تمہارے سامنے بیٹھی ہوئی یکدم اٹھ جاؤں اور یک طرفہ ٹکٹ کو ریٹرن ٹکٹ میں بدلنے کے لیے تم سے بھی بے نیاز ہو جاؤں..''

نتالیہ کا کل بدن..ماتھے سے ٹخنوں تک..تلووں تک جو جوگرز میں مجوس تھے..پسینے میں شرابور تھا..اسے اتنی شدید گرمی کی عادت نہ تھی..اس کے شہر میں برف گرتی تھی..سیاہ بلاؤز کی ڈوریاں محض چھاتیوں کو سنبھالتی تھیں..انہیں ڈھکتی نہ تھیں..اور ان کے درمیان صلیب بے پردہ دکھائی دے رہی تھی..

''اگر تم واپس نہیں جا رہیں تو..یہاں رہ کر کیا کرو گی؟''

''اس کا فیصلہ تم نے کرنا ہے..''

وہ ایک اور سناٹے میں چلا گیا..

''وہ کیسے؟''

''میں تمہارے ساتھ..رہنا چاہتی ہوں۔''

وہ اس دھچکے سے سنبھلا تو ان دونوں کے آس پاس لاہور کے آخری کناروں پر ایک نوآباد بستی کی ویرانی تھی..کہیں اکا دکا زیر تعمیر گھر تھے..دھوپ میں اکڑتی سمٹتی سڑکوں کا ایک جال تھا' جن کے کناروں پر سرکنڈوں سے اٹے ہوئے وہ پلاٹ تھے جو ابھی برائے فروخت تھے...بے شجر اور چٹیل ویرانے میں سربلند پانی کی ٹینکیاں تھیں اور سڑکوں کے کنارے ناتواں زرافوں کی مانند منہ اٹھائے بجلی کے کھمبے تھے جو دھوپ کی شدت سے پگھل کر کبڑے ہوئے جاتے تھے اور اس کی پرانی کار تھی اور اس کے باہر کھڑی نتالیہ تھی..جو اپنی پسینے میں ڈوبی ہوئی قمیض کی نچڑتی ہوئی بے پردگی سے بے خبر تھی..بے خبر تھی کہ رودین کی نظریں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی چھاتیوں اور

ان کے درمیان آرام کرتی صلیب پر بھٹکتی ہیں..

''ساتھ رہنے سے..تمہاری کیا مراد ہے؟''

''تمہاری..کون؟''

''تم..یعنی تمہاری..''

''کیا میرا کوئی نام نہیں جو تم پچھلے تین ہفتوں سے مجھے صرف..تم..تمہیں..اور تمہاری سے مخاطب کر رہے ہو..تمہیں قطعی احساس نہیں ہوا کہ ایک فرد کو اس طرح مسلسل مخاطب کرنا..اس کے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے..تم میرا نام کیوں نہیں لیتے..''

''مجھے قطعی احساس نہیں ہوا تھا..'' وہ اتنا شرمندہ ہوا کہ گرمی کی شدت میں اضافے کی وجہ سے نہیں شرمندگی کے باعث وہ پسینے میں بھیگ گیا ''نتالیہ..'' صرف اتنا کہہ کر وہ پھر شرمندگی میں ڈوب گیا..اور پھر کچھ دیر کے بعد بولا ''ساتھ رہنے سے تمہاری کیا مراد ہے..نتالیہ!''

''تمہارے آس پاس..تمہاری نزدیکی میں..''

''ایک ساتھ..ایک ہی گھر میں..''

''ہاں..''

''تم نے کیا کہا تھا کہ تم مجھ سے مل کر مایوس ہوئی ہو..اس کے باوجود؟''

''میرے پاس اس کے سوا کوئی چارا نہیں..''

''مجبوری ہے؟''

''نہیں..''

''اور اگر میں انکار کر دوں تو..''

''تو میں منت سماجت نہیں کروں گی..نہیں'' وہ یکدم اتنی پرائی ہوگئی کہ اسے اس سے ڈر آنے لگا..''نہیں..میں واپس نہیں جا رہی..میرے بابا کے مرقد کے آس پاس متعدد کوٹھڑیاں ہیں جن میں دور دراز سے آئے ہوئے..ایران اور افغانستان سے آئے ہوئے درویش قیام کرتے ہیں..میں ان میں سے کسی ایک کوٹھڑی میں رہائش اختیار کر سکتی ہوں..کسی کو یہ بتائے بغیر کہ بابا میرے کیا لگتے تھے..''

''ایک کاغذی رابطے کے باوجود..اور وہ بھی پچیس برس پرانا..ہم ایک دوسرے کے لیے مکمل طور پر انجانے ہیں..کسی حد تک ناواقف ہیں..''

''گویا تم انکار کر رہے ہو..''

اس کی کوئلہ سیاہ آنکھیں لاہور کی تپش میں مزید سلگتی تھیں..اور جب اس نے اپنی آنکھوں کو کچھ دیر سلگتے رکھا اور پھر کہا کہ..گویا تم انکار کر رہے ہو..تو وہ بھڑک اٹھیں..اس کی درمیانی عمر ایک خوفزدہ کوہ پیما کی مانند گہرائی میں گونجتے ایک پرشور پہاڑی نالے کے آر پار رکھے ایک شہتیر کے درمیان میں معلق تھی..وہ کسی لمحہ بھی نیچے..بڑھاپے کے پانیوں میں گر سکتی تھی..لیکن ابھی تک وہیں قائم تھی اور اس کے باوجود اس کی موجودگی اور بدن کی نمی میں ایک بے بہا کشش تھی اور..اس نے ایک عرصے سے کسی عورت کو یوں بے طرح محسوس نہیں کیا تھا..

وہ ایک فارغ شخص تھا..

ڈھل چکی عمر کا کسی حد تک ناکارہ ہو چکا شخص تھا..

اپنی بیوی سے بھی فارغ ہو چکا تھا..گھر کے نزدیک جو اس آبادی کے حصے کا قبرستان تھا' وہ کبھی کبھار وہاں جاتا تھا اور اس کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر نہ کوئی دعا کرتا تھا اور نہ کوئی خواہش..کچھ دیر خاموش کھڑا رہ کر واپس آ جاتا تھا..گھر واپس آ کر اسے قلق ہوتا تھا کہ اسے کم از کم اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا کہ اس نے اس کے بچوں کو پالا..اسے بھی سہولت دی..محبت دی..لیکن ڈھل چکی عمر کا شخص ان اخلاقیات اور محسوسات سے ماورا ہو چکا ہوتا ہے..کسی حد تک بے حس ہو جاتا ہے..بلکہ خود غرض ہو جاتا ہے..اس کی غرض صرف یہ رہ جاتی ہے کہ اس کی موجودہ زندگی میں کوئی خلل نہ آئے..اسے اس کی چائے کی پیالی وقت مقررہ پر ملتی رہے..سردیوں میں غسل خانے کے شاور میں سے گرم بھاپ آلود پانی اترتا رہے اور گرمیوں میں ایئر کنڈیشنر کی سرد ہوا کے سامنے اپنے پسندیدہ نرم تکیے میں سر دیئے جب وہ اونگھ رہا ہو تو کوئی اسے ڈسٹرب نہ کرے..اور اخبار والا ناغہ نہ کرے..

ڈھل چکی عمر کے ایک شخص کی روٹین یہی ہوتی ہے اگر اس کی آل اولاد اپنے بال بچوں میں اور زندگی کی دوڑ میں مگن ہو چکی ہو..

''نہیں..میں انکار نہیں کر رہا..''

''میں سوانی نہیں ہوں سیّد زادی ہوں' یہ یاد رکھو..لوگ مجھ سے سوال کیا کرتے تھے..میری انگلیوں میں سے ابھی تک لہسن اور پیاز کی بو نہیں گئی..تم مجھ پر احسان نہ کرو..'' اس کے چہرے کی تمتماہٹ کی سرخی پر سے بے رنگ پسینے کی دھاریں سوچ سوچ کر آہستہ آہستہ اتر رہی تھیں..

''مجھے غلط نہ سمجھو..میں تو ایک بیکار ہو چکا' ڈوبتا ہوا شخص ہوں جو ایک تنکے کے سہارے کو بھی غنیمت جان سکتا ہوں..جب کہ تم تو..تم ہو..''

وہ آنکھوں کی سلگاہٹ سمیت پرائی اور بیگانی ہوئی بیٹھی رہی اور کچھ نہ بولی..البتہ اس کے جبڑے کی نم مہک بولتی رہی..''ہم مکمل طور پر انجانے ہیں یہ تم نے کہا...ناواقف ہیں ایک دوسرے سے..یہ تم نے کہا..''

وہ اپنی عمر کی غنودگی میں چلا گیا۔

اس نے سراسر جھوٹ بولا تھا..محض کچھ کہنے کے لیے..کچھ کہہ دیا تھا..وہ اس کے لیے کیسے انجانی اور ناواقف ہو سکتی تھی..ایک اجنبی ہو سکتی تھی..وہ..ان خطوط کے سہارے اسے اپنی ہتھیلی کی لکیروں کی طرح جانتا تھا کہ کون سی لکیر کدھر ٹوٹتی ہے' کون سی ٹوٹے بغیر مسلسل چلتی ہے اور کدھر انگوٹھے کے ابھار میں گہری ہو جاتی ہے..یہ لکیریں اس کے کئی برسوں میں لکھے گئے خطوط میں واضح ہوتی چلی گئی تھیں..کہیں کوئی ابہام نہ تھا' کوئی الجھاؤ نہ تھا..جولاہی کے کاغذی کھیس پر ہر گل بوٹا واضح ابھرتا اور اپنا مطلب بیان کرتا تھا' وہاں انجانے پن اور ناواقفیت کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی..اس کے خط ایسے وقتی ابال نہ تھے جو کسی خوشبودار رنگین کاغذ یا فینسی لیٹر پیڈ پر رقم کیے گئے تھے بلکہ کھردرے کاغذوں پر صفحہ در صفحہ اپنی جان پہچان اور واقفیت کرواتے تھے۔

روزانہ..تاریخ وار..کسی حد تک ایک ڈائری کی صورت میں..جو کچھ بھی اس کی حیات میں ظاہر ہوتا تھا وہ رجسٹر کے کھردرے لکیر دار کاغذوں پر ایسے منتقل کرتی تھی' جیسے بحیرہ مردار کی غاروں میں سے برآمد ہونے والے چمڑے کے مخطوطوں پر کسی زمانے میں قدیم پیغمبر اپنی داستانیں رقم کرتے تھے..

اس نے اسے..نتالیہ نے رودین کو..ان برسوں میں اپنی روزمرہ حیات کی کون سی تفصیل نہیں لکھی تھی..

اگرچہ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لکھنے والا لکھتا چلا جاتا ہے اور اسے پچیس برس کا فاصلہ طے کر کے کچھ یاد نہیں رہتا کہ تب اس نے کیا لکھا تھا اور اگر وہ بعد میں اپنی تحریر پڑھتا ہے تو کسی قدر پریشان اور بہت حیران ہوتا ہے کہ یہ میں نے لکھا ہے اور کبھی کبھار شرمندہ بھی ہوتا ہے..لیکن جو اس تحریر کو پڑھنے والا ہوتا ہے چونکہ اسے بہت اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ سے لطف اندوز ہوتا' کبھی دکھ میں اور کبھی سکھ میں جاتا اسے پڑھتا ہے اس لیے جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے وہ اس پر نقش

ہو جاتا ہے.. جیسے کوہ طور کے ایک پتھر پر فرمان نقش ہو گئے تھے.. یوں.. نتالیہ کے روزمرہ کی تفصیلات جو وہ تو یقیناً بھول چکی ہو گی.. اسے یاد تھیں..

وہ.. صبح سویرے.. منہ اندھیرے.. بیدار ہو کر.. کسل مندی سے اپنی کوئلہ آنکھیں مسلتی.. بنگالی بال سلجھاتی جب کھیتوں میں نکل جاتی تھی اور.. منہ اندھیرے اس لیے بھی نکل جاتی کہ کوئی نامحرم ایک سید زادی کا محرم چہرہ نہ دیکھ لے تو وہ جھک کر شٹالے کے ہرے بھرے کھیتوں.. بوٹوں اور کونپلوں پر اپنا وہ ہاتھ پھیرتی.. ان کے ہریاول کو مس کرتی.. چھوتی.. وہ ہاتھ پھیرتی جس کی انگلیوں کی پوروں میں لہسن اور پیاز کی بُو تھی.. چلتی جاتی تھی.. اور چارے کے کھیتوں پر جو صبح سویرے کی شبنم معلق ہوتی تھی' اسے اپنے ہاتھ سے سمیٹتی یوں چلتی جاتی تھی کہ بہت دور سے نظر آ جاتا تھا کہ سبزے کے ہرے سمندر پر کوئی ہاتھ ایک کشتی کی مانند رواں ہوا ہے اور نظر آتا ہے کہ وہ کہاں کہاں سے گزرا ہے..

جہاں جہاں اس کی ہتھیلی؟ بوٹوں پر پھسلتی' ان کو چھوتی چلتی تھی.. جیسے ایک بزرگ ایک بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتا ہے ایسے.. وہاں وہاں وہ بوٹے شبنم سے عاری ہوتے چلے جاتے تھے.. ایک راستہ دکھائی دیتا تھا..

اور جب وہ منہ اندھیرے کھیتوں میں نکل کر واپس آتی تھی.. سلگتے راکھ بھرے اپلوں پر رات بھر دھری دودھ کی چاٹی پر دھیرے دھیرے دبیز ہوتی اور قدرے سرخ ہوتی اپلوں کی مدھم مہک لیے.. گھنی بالائی کی تہہ کو بے آرام کیے بغیر گندم کے خشک بُوٹے کی نالی کو اس میں داخل کر کے نیم گرم دودھ تک رسائی حاصل کر کے کیسے وہ بھورا ہوتا گھنا دودھ سُرکیاں لے کر ایسے پیا جا سکتا ہے کہ اس کی ماں یہ کبھی نہ جان سکے کہ بالائی کی تہہ کو بے آرام کیے بغیر.. یہ دودھ کیسے کم ہو جاتا ہے۔ وہ دودھ پیتی تھی۔

کیسے وہ اپنے کمیونسٹ بھائی کی فراہم کردہ روسی ادب کی ترجمہ شدہ کتابیں سینت سینت کر اپنے سینے سے لگائے رات گئے تک پڑھتی رہتی تھی اور ان میں یوں حل ہو جاتی تھی کہ وہ اپنے سان گمان میں نہ رہتی تھی.. انہی کا ایک کردار ہو جاتی تھی..

بابا کے دربار میں سنہری بالوں والا نوجوان درویش سر جھکائے عبادت میں مگن تھا' وہ کیسے اس کے سحر میں گرفتار ہوئی تھی..

سحر میں یا عشق میں..

جیسے عشق اور شرک ایک ہیں..ایسے سحر بھی ایک سازشی ہے جو جوان میں شامل ہو جاتا ہے..

اس نے اپنے خطوں میں وہ کچھ بھی کھول دیا تھا..جو کھولا نہیں جا سکتا..وہ سب بھی بیان کر دیا تھا..جو اپنے آپ سے بھی بیان نہیں کیا جا سکتا..

تو وہ یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ ہم ناواقف ہیں..انجان ہیں..

ایک ناواقف اور انجان عورت اپنی شادی کے اگلے روز ایک ایسا خط کیوں کر لکھ سکتی ہے..

تسلیمات!

تو آخر....بقول میری ایک پروفیسر مسز قریشی کے ع پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا....وہ سب کچھ ہم پر گزر گیا جو سب چاہتے تھے....اور آپ بھی۔ وہی انجام اپنی دوسری رشتہ دار بہنوں والا۔ مگر وہ تو اتنی خوش ہوتی ہیں اس ''انجام'' پر۔ اور مجھے تو آج جب کہ بائیسواں دن ہے ناصر کی ملکیت بنے یہ ابھی تک سمجھ نہیں آ رہا کہ اس سب چکر میں آخر ایسی خوشی کی بات کون سی ہوتی ہے جو لوگ اتنے خوش ہو لیتے تھے اور اتنی آسانی سے اور خاص طور پر لڑکیاں بھی۔

میں اپنے گھر آئی ہوئی ہوں۔

دل اس قدر اداس ہوتا ہے جب گھر آتی ہوں کہ یہ اب میرا گھر نہیں رہا۔ میرا پیارا کمرہ' اس کی کھڑکی' اس کی الماریاں' میرا پلنگ' میرا بستر' میری کتابیں۔ پچھلے صحن میں میرے پسندیدہ گوشے پودے' درخت' پھول' گھاس' چیکو (کتا) اور روشی (بلی) یہ سب پیاری چیزیں جو ہمیشہ سے میری تھیں' مجھے خوشی دینے کے لیے بنی تھیں اب میری نہیں رہیں۔ میں یہاں مہمانوں کی طرح آتی ہوں مالکوں کی طرح نہیں رہ سکتی۔ خدایا! لڑکی ہونا کتنی خوفناک بات ہے اور شادی ہونا اس سے بھی زیادہ بھیانک۔ کیوں سمجھا جاتا ہے! شاید آپ بھی سمجھتے ہیں کہ لڑکی کی شادی کر دینا سب سے اہم اور خوشی کی بات ہے....مجھے تو اپنے سے زیادہ خوش نصیب روشی لگتی ہے اپنی بلی جو تمام زندگی اگر چاہے تو اُسی مانوس اور پیارے

گھر میں اپنی پیاری چیزوں کے درمیان رہ سکتی ہے جہاں وہ پلی بڑھی۔ وہ تو اب بھی میرے بستر پر میرے کمرے میں بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے خواب دیکھ سکتی ہے اس احساس کے ساتھ کہ وہ اپنے گھر میں اپنی جگہ پر ہے۔ جب کہ میرے تمام خواب' تمام پیار یہیں ان چوبیس سال کی مانوس پیاری چھوٹی چھوٹی چیزوں میں رہ گئے ہیں اور مجھے دنیس نکالا مل گیا ہے.... اسے کون خوش نصیبی کہہ سکتا ہے.... مگر لوگ کہتے ہیں۔

میرے عزیز.... عزیز.... عزیز ترین انسان یعنی کہ رُودین! تم کو بتاؤں کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے جسمانی طور پر میری موت واقع ہو چکی ہے۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے میرا غرور' میری پاکیزگی اور میری خوبصورتی۔ لگتا ہے کہ جیسے سب کچھ ختم ہو چکا ہے' بک چکا ہے اور میں اب ان میں سے کسی بھی چیز کی مالک نہیں.... اور میں اپنے ذہن سے تنگ آ چکی ہوں۔ میں سوچنا نہیں چاہتی' سوچنے سے ڈرتی ہوں۔ اپنے ذہن سے ڈرتی ہوں.... اور اس خیال سے بڑا شکر بجالاتی ہوں کہ ناصر میرا ذہن نہیں پڑھ سکتا.... اس نے میرے جسم کو مار ڈالا لیکن میرا ذہن آزاد ہے اور زندہ اور اس کے اختیار و تصرف میں نہیں۔ اپنے آپ کو اتنا کمینہ اور بُرا محسوس کرتی ہوں کہ وہ اتنا خوش ہے' اُس بچے کی طرح جسے چاند مل جائے کھیلنے کو۔ ایسا لگتا کہ جیسے وہ اس خوشی میں اپنی ماں کا غم بھی بڑی جلدی بھول رہا ہے۔ وہ اتنا بے پناہ پیار کرنے والا ہے کہ جس کا کوئی حد و حساب نہیں.... مگر میں اپنے آپ کو کیا کروں۔ میں تو اُس کی ہر بات' ہر حرکت پر بس یہی سوچنے لگتی ہوں کہ.... اگر اُس کی جگہ تم ہوتے تو کیا ہوتا! اور ہر خوشی' ہر جذبہ نامکمل لگتا ہے۔ ساری مصیبت یہ ہے کہ میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا تھا اس دنیا میں ایک پیکر اور ایک نام کی شکل میں۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں نے آپ کو ڈھونڈ تو لیا تھا' آپ مل تو گئے تھے مگر مل کر بھی نہ ملے تھے۔ حاصل ہو کر بھی حاصل نہ تھے۔ ہم ایک دوسرے کو کبھی حاصل نہ تھے لیکن اس کے باوجود.... کیسی عجیب بات ہے کہ.... جب پہلی بار.... ناصر نے میرے غرور' میری پاکیزگی' خوبصورتی اور دوشیزگی پر تصرف حاصل کیا.... تو اس کے بعد میرا دل چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں اور مر جاؤں.... میں نے تمہیں پایا کبھی

نہیں تھا لیکن اُس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے بس اب میں نے تمہیں کھو دیا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جیسے تم اب تک اِس تصرف سے پہلے تک مجھے حاصل تھے مگر اب نہیں رہے اور اب کبھی نہ مل سکو گے اور لگ رہا تھا کہ جیسے میں نے اب اپنے آپ کو بھی کھو دیا ہے' ختم کر دیا ہے اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی ہوں تم سے بھی اور خود سے بھی اور یہ کتنی عجیب اور سمجھ نہ آنے والی سوچ ہے کہ جیسے میرے نزدیک میری تمام خوبصورتی اور دوشیزگی کا دوسرا نام تم تھے۔ جب میں نے اسے کھو دیا تو یہی احساس ہوا کہ اب تمہیں بھی کھو دیا۔ (پتہ نہیں فرائڈ اس کی کیا توجیہہ کرتا) اور شاید اسی دکھ اور غصے اور بے بسی میں اپنے جسمانی طور پر مر جانے اور تمہیں کھو دینے کے دُکھ میں میں نے شادی کی اگلی صبح (یعنی لوگ جسے سہاگ رات کہتے ہیں اس کی صبح) بلکہ بہت صبح سویرے ایک اچھا خاصا ڈرامہ کر دیا....اور سب کو پریشان کر دیا' سب سے زیادہ ناصر کو۔ اب یاد کرتی ہوں تو ہنسی آتی ہے مگر پتہ نہیں مجھے کیا ہوا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ....صبح کی روشنی ہلکی ہلکی نظر آئی تھی تو میں بس ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی بستر پر اور رونا شروع کر دیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ بے تحاشہ روؤں' خوب چیخ چیخ کر شور مچا کر۔ اتنے بہت سے غم اور دکھ تھے لگ رہا تھا میں مر چکی ہوں' فنا ہو کر ختم ہو چکی ہوں۔ میں نے ہر چیز کھو دی ہے اور میں سچ مچ مر جاؤں تو کتنا اچھا ہو۔ اپنا گھر' اپنا کمرہ' اپنی ہر چیز اتنی شدت سے یاد آ رہی تھی کہ دل چاہ رہا تھا بس ابھی وہاں واپس چلی جاؤں اور اپنے کمرے میں اپنے بستر پر اُس بستر پر جس پر سالوں سے سوتی آئی تھی جا پڑوں اور روتے روتے مر جاؤں....مگر ہوا یہ تھا کہ ناصر بے چارہ جو غالباً اُسی وقت بمشکل کچھ سویا تھا کہ ایک دم میرے رونے پر جاگ اُٹھا تھا اور وہ بھی گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا....اور پھر اس نے اتنی محبت' اتنے خلوص اور بزرگی سے مجھے سینے سے لگا کر چپ کرایا تھا کہ جیسے میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں اور مجھے واقعی سکون ملا تھا' کتنی عجیب بات تھی کہ جو میرا قاتل تھا' وہی مسیحا بھی بن گیا تھا....میں نے اسے بتایا تھا کہ بس میرا دل سخت گھبرا رہا ہے اور مجھے ڈر لگ رہا ہے ہر چیز سے اور دم گھٹ رہا ہے۔ بس میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے بعد میں اس کے سینے سے لپٹے ہوئے ہی سو گئی تھی مگر بعد میں پتہ چلا کہ

میں تو بے ہوش ہوگئی تھی۔ ناصر نے گھبرا کر اپنی بہنوں' بھابی وغیرہ کو جگایا تھا۔ سب اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک بندہ فوراً سوان کو بلانے بھاگا تھا اور جب میں جاگی تھی یا مجھے ہوش آیا تھا تو سوان میرے پاس میرے پلنگ پر بیٹھا تھا اور ناصر اور سب دوسرے لوگ کھڑے تھے اور مجھے پھر پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ سوان کو دیکھ کر مجھے اپنے مرنے' اپنا گھر اور اپنے خواب کھو دینے کا خیال پھر آ گیا تھا اور میں نے پھر بے تحاشہ رونا شروع کر دیا تھا.... اور شوہر اور بھائی میں کیا فرق ہوتا ہے یہ بات مجھے اُس پہلی صبح ہی پتہ چل گئی تھی کہ سوان کے گلے لگ کر جب میں نے رونا شروع کر دیا تو وہ اتنا سخت کمیونسٹ اور لاشوں کو چیرنے پھاڑنے والا سخت دل لڑکا.... میرا پیارا بھائی' وہ بھی رونے لگا (جب کہ ناصر نے صرف مجھے چپ کرایا تھا) میں نے کہا کہ میں بس ابھی گھر چلنا چاہتی ہوں' مجھے اپنے ساتھ لے چلو گھر۔ تو فوراً راضی ہو گیا کہنے لگا ہاں بس ٹھیک ہے چلو اٹھو چلتے ہیں.... مگر پھوپھو نے جو میرے پاس آئی ہوئی تھیں اُسے یاد دلایا کہ یہ ماسکو نہیں پاکستان ہے اور مجھے بھی احساس دلایا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے جو میں نے گھر جانے کی رٹ بچوں کی طرح لگا لی ہے۔ میں کوئی بچی نہیں ہوں سب لوگ رشتہ دار کیا کہیں گے کہ یہ روتی ہوئی صبح ہی سسرال سے گھر آ گئی۔ ولیمے سے بھی پہلے اور بھائی لے آیا۔ ہزار باتیں بنیں گی تو مجھے عقل آئی اور واقعی میں نے غور کیا' تو ناصر کی اور میری بہنوں اور سب دوسری رشتہ داروں کی نظریں مجھ پر بڑی متجسس تھیں۔ آپا بھی میرے ساتھ ہی آئی تھیں۔ وہ مجھے چپکے چپکے سمجھانے لگیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ کیا اسے دولہا پسند نہیں آیا.... ہوش میں آؤ کیا کر رہی ہو' کچھ عزت کا خیال کرو' کوئی بھی لڑکی ایسا نہیں کرتی جو تم کر رہی ہو نہ ماں باپ کی عزت کا خیال ہے نہ سسرال کی عزت کا۔ تو واقعی مجھے عقل آ گئی۔ ناصر بے چارہ الگ مجرموں کی طرح سر جھکائے پھر رہا تھا۔ پریشان اور شرمایا جیسے یہ سب کچھ محض اس لیے ہو رہا ہے کہ اُس نے مجھے بڑا پریشان کیے رکھا تھا شب بھر.... اور شاید بات بھی یہی تھی۔ لیکن باجی نے مجھے سمجھایا تو میں نے سوچا کہ واقعی مجھے نارمل نظر آنا چاہیے اور میں ایک دم خوش نظر آنے لگی۔ میں نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا' تیار ہوئی اور ناصر کی آپا میری سہیلیوں کے پیچھے پڑ گئیں' انہیں گالیاں